مولانا متین ہاشمی مرحوم
ایک برگزیدہ شخصیت

محمد یسین مظہر صدیقی
ادارہ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

نقوش لاہور کے ذریعہ مولانا سید محمد متین ہاشمی مرحوم کے نام سے تعارف ہوا اور مدیر نقوش محمد طفیل مرحوم کے ذریعہ مولانا ے مرحوم کی ذات والاصفات سے۔ اپریل ۱۹۸۵ء میں جب پہلی بار لاہور کی زیارت کی سعادت ہوئی تو مدیر نقوش کی زبانی مولانا مرحوم کی ذاتی اور صفاتی خوبیوں کی اتنی تعریف سنی کہ ان کا گرویدہ ہوا اور پہلی فرصت میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اتنی محبت، اتنی شفقت اور اتنے خلوص سے ملے کہ غریب الوطن زائر سرشار ہو گیا۔

مولانا مرحوم سے پہلی ملاقات ہی کافی طویل اور مفصل رہی۔ تعارف کے پہلے لمحہ میں تو مولانا خوابیدہ سے نظر آئے مگر جیسے ہی نقوش رسول نمبر میں مطبوعہ میری کتاب عہد نبوی میں تنظیم ریاست و حکومت کا حوالہ سے تعارف کا دوسرا لمحہ آیا تو مولانا اٹھ کر بغلگیر ہو گئے شفقت سے سر پہ ہاتھ پھیرا میرے کام اور محنت کو خوب سراہا اور بھرپور تعریف کی حالانکہ یہ بھی کہتے جاتے کہ رو در رو تعریف نہ کرنی چاہیے پھر اپنی تعریف و توصیف کے طویل سلسلہ کو ایک جملہ میں سمیٹتے ہوئے فرمایا کہ "اگر مدیر نقوش کا لحاظ مانع نہ ہوتا تو میں آپ کی کتاب پر ڈاکہ ڈال دیتا اور چھاپ لیتا"۔ سچ یہ ہے کہ مؤلف و مصنف کو تعریف سے خوشی ملتی ہے مگر مولانا محمد متین ہاشمی مرحوم جیسے صاحب علم و فضل اور جہاندیدہ بزرگ سے اپنے کام کی ایسی تعریف سن کر افتخار بھی محسوس ہوا۔

لاہور و کراچی کی اس اولین زیارت کے دوران مولانا محمد متین ہاشمی صاحب سے کئی ملاقاتیں رہیں۔ اور سب کی سب ان کے ادارہ دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری نسبت روڈ کے سرکاری کمرے

میں ہی ہوئیں۔ مولانا نے روایتی پاکستانی مہمان نوازی اور اس سے زیادہ اصلی اسلامی خورد پروری کا ازحد ثبوت دیا۔ سرکاری مصروفیات کے باوجود پوری توجہ اور محبت سے زائر کی پذیرائی کی، اس کا اکرام کیا۔ اس کی مہمانی کی اور اپنے ادارے کی کتابوں اور رسالوں کے گراں قدر عطیے سے نوازا۔

اپریل ۱۹۸۵ء سے نومبر ۱۹۹۱ء تک مولانا مرحوم سے آٹھ دس ملاقاتیں رہیں۔ لاہور کے قیام کے دوران ان سے ملے بغیر چین نہ آتا۔ وہ اتنی محبت اور یگانگت سے ملتے تھے کہ بار بار اس کی سعادت سے بہرہ مند ہونے کو جی چاہتا۔ ان کی خدمت میں بیٹھ کر ان کی گفتگو سن کر اور ان سے تبادلۂ خیالات کر کے دل شاد اور قلب آباد رہتا۔ ان زیارتوں میں مجھ ہیچمداں پر ان کے اوصاف کھلے اور ظاہر ہے کہ ان پر میری خامیاں روشن ہوئی ہوں گی۔

ان سے آخری ملاقات جولائی ۱۹۹۱ء میں برادر مکرم مولانا ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی استاذ اردو ادب بنارس ہندو یونیورسٹی کی معیت میں ہوئی۔ تعارف دونوں حضرات کا اس خاکسار نے کرایا۔ مولانا مرحوم بڑے بذلہ سنج اور نکتہ رس تھے۔ برادرم ظفر صاحب کی متشرع صورت شرعی ریش، شیروانی، ٹوپی اور ہیئت کذائی دیکھ کر اپنے مخصوص لہجے میں ادارہ کے بعض اراکین اور حاضرین مجلس سے مخاطب ہو کر بولے: "ہندو یونیورسٹی میں اس شکل و صورت کے ساتھ" اور قہقہہ لگایا۔ خاکسار نے عرض کیا کہ جی ہاں ہمارے ہاں ہندو ایسے بھی ہوتے ہیں۔ خوب محظوظ ہوئے۔ ظفر صاحب سے گفتگو کے دوران انکشاف ہوا کہ ظفر صاحب کے والد مرحوم مولانا محمد متین صاحب کے دارالعلوم دیوبند میں ہم جماعت ساتھی اور عزیز ترین دوست تھے۔ مولانا مرحوم نے اپنے مرحوم دوست کا تذکرہ بڑی دیر تک غمناک لہجہ اور گلوگیر آواز میں کیا اور ظفر صاحب پر محبت کی بارش کر دی۔

ایسے مواقع پر بالعموم معاملہ طرفین کا ہو جاتا ہے اور باقی اطراف نظر انداز ہو جاتے ہیں۔ مولانا محمد متین صاحب نے جذبات محبت کے درمیان بھی توازن نہ کھویا۔ ظفر صاحب سے ان کے والد مرحوم کی باتیں کرتے رہے، ان کی خوبیاں گناتے رہے، ان کی لیاقتوں پر عش عش کرتے رہے، ان کی جوان مرگ پر افسوس کرتے رہے لیکن گفتگو میں مجھے برابر کا شریک رکھا۔ اور اسطرح شریک وسہیم رکھا کہ میں اپنے دوست اور رفیق کے والد مرحوم سے قربت و قرابت محسوس کرنے لگا۔ مولانا مرحوم نے اپنے دوست کی یادوں پر مشتمل ایک تذکرہ لکھنے کا وعدہ ظفر صاحب سے کر لیا

تھا معلوم نہیں کہ اپنی بیماری، معذوری اور دل شکستگی کے عالم میں اسے پورا کر سکے یا نہیں یا وہ ہدیہ محبت اپنے دل ہی میں بسائے مرحوم دوست کے پاس عالم آخرت میں ان کے حوالے کرنے اپنے ساتھ لے گئے۔

مولانا محمد متین ہاشمی مرحوم الفت و محبت اور یگانت و پیار کا پیکر تھے۔ ان میں جذبات کی شدت تھی جو اکثر نظر نہ آتی تھی لیکن کبھی سیلاب بن کر آنکھوں سے پھوٹ نکلتی تھی اور کبھی جذبات دوسرا رُخ اختیار کر لیتے۔ مولانا مرحوم سے ان کے جوانا مرگ فرزند اور پاکستان کے ابھرتے دانشور و عالم سراج منیر مرحوم ناظم ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور کی حسرت ناک وفات پر ہم نے جب تعزیت کی تو دل و روح میں موجزن جذبات محبت کا دھارا پھوٹ بہا۔ فرمانے لگے: "بھائی میرے! اس موت نے تو مجھے ختم کر دیا۔ اب کچھ باقی نہیں رہا!" اور ہم دیکھ رہے تھے کہ ان کا جسم بُری طرح ٹوٹ پھوٹ گیا ہے۔ ان پر فالج اور دوسرے عوارض کا اثر ہو چکا تھا اور وہ سہارا لے کر دفتر میں تشریف لا سکے تھے۔ ان کے دل کے کرب و اندوہ کا تھوڑا سا اندازہ مجھ مبتلائے الم کو تھا کہ فرزند اور ناشگفتہ پھول جیسے فرزند کو اچانک کھو دینے کا کرب کتنا شدید اور جان لیوا ہوتا ہے۔ مولانا مرحوم کو ان کے فرزند کی اچانک رحلت کا غم چاٹ گیا۔

مجھے ہمیشہ اس کا قلق رہے گا کہ مولانا مرحوم سے ساری ملاقاتیں ان کے دفتری کمرے میں کرتا رہا۔ اور ان کے اصرار و تقاضے کے باوجود ان کے دولت خانے پر حاضری نہ دے سکا۔ خیال تھا کہ استفادے کے بہت سے مواقع آئیں گے اور پھر کبھی حاضری دیں گے۔ مگر یہ ممکن ممکن میری مصروفیات اور بعض دوسری مجبوریوں کے سبب نہ ہو سکا۔

نومبر ۱۹۹۱ء کے دوسرے عشرے کے دوران جب اندلس کے مسلم ثقافتی ورثہ کے بین الاقوامی سیمینار میں شرکت کی غرض سے لاہور کی آخری زیارت کی سعادت ملی تو مولانا محمد متین ہاشمی بیمار اور صاحب فراش تھے۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور کے موجودہ ناظم ڈاکٹر سہیل عمر صاحب کے گھر پر غالباً مرض الموت سے نبرد آزما تھے۔ سہیل صاحب محترم سے فون پر مولانا مرحوم کی علالت کی خبر ملی۔ فون ہی پر ان کی عیادت کر لی۔ ان کی حالت ایسی نہ تھی کہ زائرین کی زیارت اور عیادت کرنے والوں کی عیادت کا بوجھ برداشت کر سکیں۔ اور اپنی قسمت نہ تھی کہ ان کی زیارت سے آنکھیں روشن اور دل شاد کر لیا جائے۔ ہم سب سخت مادہ پرست ہوتے جا رہے ہیں۔ تعلقات

محبت والفت کو بھی فائدہ ونقصان کی میزان میں تولتے ہیں اور پھر فائدہ کی صورت میں الفت جتاتے اور محبت کرتے ہیں ورنہ اپنے کام سے لگے رہتے ہیں۔
سیمنار کی ہمہ ہمی اور مدت قیام کی کمی نے مولانا مرحوم کی اس آخری علالت میں ان کی زیارت سے محروم رکھا۔ ڈاکٹر سہیل عمر صاحب بھی اندلس واقبال نامی سیمنار میں شرکت کے لیے قرطبہ / اندلس کے لیے پابہ رکاب تھے۔ ادھر ہم سیمنار کے جال سے چھوٹے تو وہ گرفتار ہونے کے لیے پرواز کر گئے۔ آخری زیارت لاہور میں مولانا مرحوم سے ملاقات کی سعادت نہ مل سکی۔
جنوری ۱۹۹۲ء کے وسط میں برادرم ابوسفیان اصلاحی استاذ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اندوہناک خبر لائے کہ مولانا محمد متین ہاشمی اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مدیر نقوش طفیل مرحوم کے بعد خاکسار نے لاہور میں اپنا ایک اور بزرگ سرپرست کھو دیا اور ہم سب انکی محبت والفت سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئے۔
بلاشبہ مولانا سید محمد متین ہاشمی مرحوم ہو گئے جس طرح ہم سب انسانوں اور فانی پیکروں کو ایک دن ہونا ہے لیکن دوسری عبقری شخصیات کی مانند مولانا مرحوم کے افکار وخیالات اور کارنامے زندہ وتابندہ رہیں گے۔ مجھے ان کے افکار وخیالات اور کارناموں کا صحیح اور حقیقی ادراک ہونے کا دعویٰ تو نہیں لیکن اپنی زیارتوں اور ملاقاتوں کے دوران ان کی خدمت میں حاضری سے جو کچھ میرے دل ودماغ پر مرتسم ہو سکا اس کا ایک مختصر تذکرہ کرنے کو جی چاہتا ہے تاکہ انکی دلفریب شخصیت کے یہ چند پہلو کاغذ وروشنائی کی وساطت سے محفوظ ہو جائیں اور میرے نہاں خانۂ دل میں چھپے نہ رہ جائیں۔ ہو سکتا ہے کہ پھر موقعہ ملے یا نہ ملے اور اگر ملے تو التفات دوستاں رہے نہ رہے۔
لیکن اس سے پہلے ایک وضاحت ضروری ہے۔ اور وہ یہ کہ افکار وخیالات کا یہ تذکرہ میرے فہم واحساس پر مبنی ہے۔ اگر اس میں کسی قسم کی واقعاتی غلطی ہو یا غلط بیانی نظر آئے تو وہ میرا قصور فہم وزلت قلم ہے۔ مولانا مرحوم پر اس کی ذمہ داری قطعی نہیں آتی۔
مولانا مرحوم طبقہ علماء سے تعلق رکھتے تھے اور برصغیر کے عظیم ادارہ دارالعلوم دیوبند کے فرزند جلیل تھے۔ اس لیے اچھا لگتا ہے کہ مولانا کے بعض افکار کا جائزہ طبقۂ علماء کے بارے میں

ان کے خیالات سے شروع کیا جائے۔ علماء کی قدر و منزلت اور علم دین کی ناگزیر ضرورت کے باوجود مولانا مرحوم موجودہ دور کے خاص کر پاکستان کے متعدد علماء کے عام طریقہ اور طرز عمل کے سخت نقاد تھے۔ ان کا احساس تھا کہ بیشتر علماء کرام سند یافتہ ضرور ہیں لیکن علم یافتہ نہیں۔ وہ دین متین کا صحیح شعور نہیں رکھتے۔ ان کی معلومات سطحی اور کتابی ہیں۔ اور وہ جدید دور میں اسلام کے عملی انطباق اور زندگی سے اس کی ہم آہنگی کے کام کے لیے نااہل ہیں۔ وہ خاص طور سے ان کے مادہ پرستانہ اور دوہرے طرز عمل کے خلاف تھے۔ انکے نزدیک علمائے وقت زیادہ تر جذبات انگیزی، اشتعال خیزی اور ہیجان انگیزی کے عادی ہو گئے ہیں اور ملت و ملک کی صحیح تعمیر کا کام کرنے سے دانستہ گریز کر رہے ہیں۔ وہ بعض حساس اور دردمند علماء کی اہلیت و لیاقت اور خلوص کے معترف بھی تھے لیکن ان کی قلت اور فعالیت کی کمی کی وجہ سے ان کے وجود کو بہت زیادہ سودمند نہیں سمجھتے تھے۔

پاکستان میں صدر شہید جنرل محمد ضیاء الحق کی قیادت میں اسلام کی تعمیر اور اسلامی زندگی کی تعمیر کے سلسلے میں مولانا مرحوم نے کافی طویل گفتگو کی۔ بہت سے لوگوں کی مانند ان کا احساس تھا کہ اسلامی نظام کی موجودہ تشکیل اور معاشرہ میں اس کے انطباق میں علماء نے اپنی ذمہ داری نہیں نباہی۔ بلکہ وہ اسلامی نظام کے اصول و اطراف کو سمجھنے سے بھی قاصر تھے۔ مولانا مرحوم اس سلسلہ میں صدر شہید کی قائم کردہ کسی مجلس کے رکن تھے۔ مجھے اس کا نام یاد نہیں رہا۔ وہ اس کے اجلاس میں مختلف اراکین کے طرز عمل اور بات چیت کے متعلق بھی سناتے تھے۔ علماء کے بعض قول و عمل کے تضاد پر سخت تنقید اور تبصرہ کرتے تھے جس میں درد و کرب بھی ہوتا تھا اور بے بسی اور لاچاری کا احساس بھی جھلکتا تھا۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایک دلچسپ قصہ سنایا۔ تصویر وغیرہ کے استعمال اور ابتلا پر گفتگو مجلس میں ہو رہی تھی کہ اسی دوران پی ٹی وی والے اپنے کیمرے لے کر پہنچ گئے۔ ابھی تصویریں پردے پر آئیں اس غرض سے علماء کی ایک بڑی جماعت بن سنور کر بیٹھ گئی اور خوشی سے تصویریں اتروانے لگی۔ مولانا نے بعد میں ان لوگوں کو آڑے ہاتھوں لیا کہ ابھی تک تو حرمت کے فتاوے دیے جا رہے تھے اور اب کیا عمل ہے؟۔ اس تذکرہ کے آخر میں یہ بھی کہہ دوں کہ اس کے قصّے تو بہت ہیں لیکن اسی پر اکتفا کرتا ہوں اور دوسرے یہ کہ میں بھی اسی طبقہ سے تعلق رکھتا ہوں تاکہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ دوسروں کے کندھے پر بندوق رکھ کر میں نے علماء کرام کی توہین کی ہے۔

ہمارے بہت سے علمائے کرام جلیل القدر اور صاحبان عزیمت ہیں مگر اکثر کو اپنے کردار پر اسلامی تعلیمات کی روشنی میں نظر کرنے کی ضرورت ہے۔

برصغیر اور خاص کر پاکستان کے دانشوروں اور غیر علماء مفکروں کے بارے میں بھی مولانا مرحوم کو کچھ زیادہ خوش فہمی نہیں تھی۔ ان کے بارے گفتگو کرتے ہوئے ان مادہ پرستانہ اور علمی اور اخلاقی لحاظ سے سطحی اور سوقیانہ طرز عمل پر سخت تنقید کرتے۔ علم و ادب کا ارتقا اور پاکستان میں اسلامیات کے کام کی رفتار پہ گفتگو کرتے ہوئے ایک بار بڑے تلخ لہجے میں کہا کہ ہمارے دانشوروں کو اصل کام سے کوئی سروکار نہیں۔ ان کو بس اپنی اہمیت جتانے اور اپنی شخصیت ابھارنے سے ساری دلچسپی ہے۔ میرے ایک سوال کے جواب میں فرمایا: مولانا! آپ ہم کو بیوقوف سمجھتے ہیں کہ خون جگر جلا کر اور ماتھے کا پسینہ بہا کر علم و فن کی خدمت کریں۔ جب ہم کو اپنا تھوبڑا (منہ) دکھا دینے سے (ٹی وی پر) دس بیس ہزار روپے بہ آسانی مل جاتے ہیں۔ کام تو بیوقوف کرتے ہیں۔

ایسا نہیں ہے کہ مولانا مرحوم ناقد محض اور محتسب خالص ہی تھے اور کیڑے نکالنے کے سوا اور کوئی کام جانتے ہی نہ تھے۔ مولانا مرحوم میں بڑا توازن تھا خیالات و افکار میں بھی اور شخصیت و مزاج میں بھی۔ دانشوروں میں وہ مدیر نقوش طفیل مرحوم اور بعض دوسرے ادیبوں، مدیروں، پروفیسروں اور علم و ادب کے متوالوں کے خلوص و محبت کے علاوہ کام سے لگن اور شغف کے قائل بھی تھے اور ان کے رطب اللسان بھی اسی طرح وہ پاک و ہند کے بہت سے علماء کے گہرے علم، دوررس نگاہ، ملی شعور، اسلامی عبقریت اور ان کے مادی کارناموں کے بھی قائل تھے اور ان کی ان تھک تعریف و توصیف کرتے تھے۔

جنرل محمد ضیاء الحق صدر پاکستان کی شخصیت اور ان کے خلوص فکر کے بہت قدر دان تھے۔ مولانا نے ان کی تعریف محض شکر گذاری کے جذبات کے تحت نہیں کی تھی کہ مرحوم جنرل نے ان کی ترقی اور عروج کے لیے کام کیا تھا بلکہ مرحوم سچے دل سے پاکستان کے اس عظیم فرزند کی شخصیت کی بلندی کے قائل تھے۔ وہ فرماتے تھے کہ شہید صدر اسلامی نظام کے قیام کے عمل میں مخلص تھے لیکن ان کو کسی طرف سے مدد نہیں ملی بلکہ ان کے اپنے ساتھیوں اور رفیقوں کے علاوہ ہر طبقہ نے ان کی راہ میں روڑے اٹکائے۔ مولانا مرحوم کو اس سلسلہ میں علمائے پاکستان سے خاص کر شکایت

تھی کہ انھوں نے اپنی گروہی عصبیت اور انا کی حد سے بڑھی ہوئی لے کے سبب پاکستان میں نظام اسلام کے قیام کا سنہری موقعہ کھو دیا۔ انہوں نے جنرل صاحب کی دور اندیشی کے بارے میں بعض واقعات اپنے ادارہ دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری کے حوالہ سے بھی سنائے کہ مرحوم کی نظر مستقبل کے بعض واقعات دیکھ سکتی تھی۔ مولانا نے اس سلسلہ میں لائبریری کو مرکزی انتظامیہ سے پنجاب کی صوبائی انتظامیہ کے تحت لانے کا واقعہ بیان کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ جنرل مرحوم نے اس کا فائدہ چند سال بعد پہنچنے کا ذکر کیا تھا جو بالکل صحیح نکلا۔ صدر شہید کے بارے میں انھوں نے اور بھی بعض واقعات سنائے اور خیالات ظاہر فرمائے تھے جن کا یہاں موقعہ نہیں۔

مولانا سید محمد متین ہاشمی مرحوم مدیر و ناشر بھی تھے لہٰذا اسکے تقاضے بھی کبھی ابھر کر آجاتے۔ پاکستان میں علم و ادب کی رفتار ترقی یا اس کی کمیت وکیفیت سے وہ خوش نہ تھے اور چاہتے تھے کہ ٹھوس اور دیرپا کام کئے جائیں۔ وہ بعض اچھے کاموں کی اسی قدر تعریف و توصیف بھی کرتے تھے۔ ان میں وہ نقوش، اردو دائرہ معارف اسلامیہ وغیرہ کے بہت قائل تھے۔ وہ بعض دوسرے اداروں کے کاموں پر بھی اپنی خوشی ظاہر کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ پاکستان کے مقابلہ میں ہندوستان کے علماء اور دانشور اور ادارے علم و فکر تیئں زیادہ پرخلوص اور دیندار ہیں۔ وہ ہندوستانی کاموں کی دل سے قدر کرتے تھے۔

وہ اپنے ادارے کے لیے حقیقی خلوص اور اپنے کاموں سے گہرا شغف رکھتے تھے۔ ادارہ کی مطبوعات اور رسائل کا معیار بڑھانے کا ہر جتن کرتے۔ انھوں نے بارہا مجھ خاکسار سے اور دوسرے خادمان علم و ادب سے مضامین اور کتابوں کا تقاضا کیا۔ اور جو اچھا کام ملا اس کو بلا تکلف چھاپ دیا۔ ہندوستانی علماء میں وہ مولانا مجیب اللہ ندوی مدظلہ اور برادرم ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی کی کتابیں شائع کر چکے تھے اور ان کی گہری علمیت کے قائل تھے۔ پاکستانی علماء میں اپنے ادارہ کی مطبوعات کے حوالہ سے ڈاکٹر نور محمد غفاری کی کتاب اور اس سے زیادہ انکی شخصیت کی تعریف کرتے تھے۔ انکی تعریف سن کر غفاری صاحب سے ملاقات کرنے کو جی چاہنے لگا۔

مولانا سید محمد متین ہاشمی کے اوصاف و کمالات اور خیالات و افکار کا تجزیہ کرنے

کے لیے دفتر چاہیے ۔ یہ مختصر تذکرہ ان کے شایانِ شان نہیں ۔ یہ صرف درصل ہم عقیدت مندوں کا خراجِ عقیدت ہے جو ان کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے اس سے ان کا افتخار و اعزاز تو کیا ہوگا ہم خاکسارانِ علم و ادب کا اکرام ضرور ہوگا ۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کی قبر کو نور سے بھر دے اور ان کی بال بال مغفرت فرما کر ہمارے لیے ان کو اسوہ حسنہ بنائے ۔